ماحصل

عابد سہیل اردو ادب کی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جنہوں نے نثری ادب کو اپنی تحریروں سے مالا مال کیا۔ انہوں نے افسانوی اور غیر افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ صحافتی خدمات بھی انجام دیں۔ جہاں ان کی کہانیوں کے تین مجموعے افسانوی ادب کے سرمایہ میں اضافے کا باعث بنتے ہیں وہیں خاکے، خودنوشت، فکشن کی تنقید، مونوگراف، اداریے اور تراجم وغیرہ، غیر افسانوی نثر کو ثروت مند بناتے ہیں۔ ان کا تعلق اخباری و ادبی دونوں صحافتوں سے رہا۔ ان کی زندگی تجربوں اور مشاہدوں سے پُر ہے جس کا مطالعہ قاری کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

سید ظفریاب حسن اور عائشہ بیگم کے گھر اورئی ضلع جالوں یو پی میں 17 نومبر 1932 کو ایک بچہ کی ولادت ہوئی جس کا نام سید محمد عابد رکھا گیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرنے کے بعد 1940 میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے والدین کے حکم کے مطابق بھوپال چلے گئے اور وہاں شاہجہانی ماڈل اسکول میں ابتدائی تعلیم کے سفر کو جاری رکھا۔ بھوپال قیام کے دوران اپنے سہیل نامی ایک دوست کے انتقال نے سید محمد عابد کو اتنا متاثر کیا کہ وہ "محمد عابد" سے "عابد سہیل" ہو گئے۔ بھوپال میں ان کا قیام اپنی پھوپی کے یہاں تھا۔ بھوپال سے عابد سہیل کی ذہنیت سازی اور مزاج کی پختگی کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں انھیں اپنے ہم عمر دوستوں کا ساتھ ملا اور پھوپی کے پیار کے ساتھ ساتھ پھوپا کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ان کی شخصیت پر ایک نئے ماحول کا اخذ وقبول شروع ہو گیا تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں

> "یہاں کی زندگی مختلف تھی لیکن نہ صرف زندگی ہی مختلف تھی میں بھی ہر دن کم سے
> کم دو دن بھر روز تبدیل ہو رہا تھا۔"(۱)

چند عرصہ قیام کے بعد عابد سہیل واپس اورئی اپنے گھر آ گئے اور یہاں کے ڈی۔اے۔وی کالج سے ہائی اسکول پاس کیا۔ والد کے انتقال کے بعد لکھنؤ آ گئے اور یہاں کرسچن کالج سے انٹر کیا پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لے لیا اور اسی یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ عابد سہیل کے استاد نے انھیں"

اے جے ایئر کے لاجیکل امپیریزم" موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے کا مشورہ دیا۔ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے عابد سہیل نے اپنا رجسٹریشن کرالیا مگر بعض وجوہات کی بنا پر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

عابد سہیل نے صحافت کو اپنا پیشہ بنایا اور صحافتی زندگی کا آغاز لکھنؤ سے نکلنے والے اخبار" قومی آواز" سے کیا، جس سے وہ 1952 میں بحیثیت اعزازی نامہ نگار وابستہ ہوئے۔ 1961 میں موقر انگریزی اخبار نیشنل ہیرالڈ میں بحیثیت سب ایڈیٹر خدمات انجام دیں اور ترقی کر کے نیشنل ہیرالڈ کے نیوز ایڈیٹر بن گئے۔ 1985 میں نیشنل ہیرالڈ سے مستعفی ہوئے اور 1990 میں روزنامہ صحافت میں خصوصی مشیر مقرر ہوئے اور تقریباً 3 سال اداریہ بھی لکھا۔ عابد سہیل لکھنؤ سے نکلنے والے اخبار پانیئر سے بھی وابستہ رہے اور 1998 سے لیکر 2010 تک مشہور اخبار دی ٹائمس آف انڈیا میں ہفتہ وار اکالم اردو پریس کے نام سے لکھتے رہے۔

عابد سہیل کی شادی 1958 میں انیس نصرت سے ہوئی تھی اور رخصتی 1964 میں۔ ایسا کیوں ہوا اس کی مکمل تشریح نہیں ملتی۔

اخبار کی خدمات سے علیحدہ ہونے کے بعد عابد سہیل نے 'نصرت پبلشر' (کتابوں کی دوکان) کی مکمل ذمہ داری سنبھال لی جو امین آباد پڑائن کی مسجد کے قریب تھا۔ عابد سہیل نے دسمبر 1962 سے لیکر جولائی 1975 تک ادب کا ایک وقیع ماہنامہ رسالہ 'کتاب' نکالا جس نے ادبی صحافت میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے روشن کر دیا۔

اس پرچہ کا آغاز اتفاقی طور پر ہوا عابد سہیل کی جانب سے کسی رسالے کی اشاعت کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لکھنؤ میں عابد سہیل کے ساتھ ایک زمانے تک ان کی والدہ اور چھوٹے بھائی بہن رہتے تھے۔ سب زیر تعلیم تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی عمران کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ ایک دفعہ عابد سہیل نے کسی بات پر انھیں سخت لہجے میں ڈانٹ دیا جس کا برا مان کر عمران نے نیند کی گولیاں کھالیں۔ طبیعت اتنی خراب ہوگئی کہ انھیں رات میں ہی میڈیکل کالج میں دخل کرانا پڑا۔ یہ اطلاع جب ان کے دوست محمد اشفاق کو ملی تو انھوں نے سارا معاملہ سننے کے بعد عمران کے لئے ایک اشاعتی ادارہ کھولنے اور ماہنامہ رسالہ کے اجرا کا مشورہ دیا۔ چونکہ یہ کام عابد سہیل کی دلچسپی کا تھا لہٰذا انھوں نے اس کے لئے حامی بھر لی۔ اور کتاب پبلی شرز کے نام سے اشاعتی ادارہ اور اسی نام سے ایک ماہانہ رسالہ کا قیام عمل میں آیا۔

جب ماہنامہ کتاب کی اشاعت کا فیصلہ ہوا تو عابد سہیل نیشنل ہیرالڈ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اپنا نام بطور مدیر نہیں دے سکتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے ایک دوست عبدالحلیم خاں کے گھر کی ملازمہ کے بیٹے جمیل احمد کو

اس کا مدیر مقرر کیا مگر بقول عابد سہیل '' جمیل احمد طویل عرصہ تک کتاب کے ایڈیٹر رہے لیکن کتاب اور وہ ایک دوسرے کے لئے بس دور کا جلوہ تھے''۔ستمبر 1968 سے اس جگہ پر شمیم الدین کا نام جانے لگا ان کا بھی تعلق اس کتاب سے برائے نام ہی رہا۔مجلس مشاورت میں عابد سہیل نے احتشام حسین اور حیات اللہ انصاری سے درخواست کی اور ان دونوں حضرات کی رائے پر اپنا نام بھی شامل کر لیا۔کتاب کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ عابد سہیل کی مساویانہ روی تھی۔انھوں نے کتاب کے صفحہ ہر کے لئے کھول دئے تھے جس میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کے مابین کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ماہنامہ ''کتاب'' نے جن اصولوں کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اس پر وہ ہمیشہ باقی رہا۔عابد سہیل نے رسالہ کی اشاعت کے وقت ہی یہ عزم کر لیا تھا کہ کوئی عطیہ قبول نہ کروں گا۔جس پر وہ آخر تک قائم رہے مگر رسالہ کی مسلسل اشاعت اور ضخامت میں اضافہ نے عابد سہیل کو دوراہوں پہ لا کر کھڑا کر دیا تھا یا تو عابد سہیل اپنی عہدہ کے اثر ورسوخ کی مدد سے محکمہ تعلقات عامہ جو تمام محکموں کے اشتہارات جاری کرتا ہے، کتاب کے لئے بھی اشتہارات حاصل کرتے ،لیکن بقول عابد سہیل '' دماغ میں ایمانداری کا کیڑا رینگا کرتا اور ایم سی کی یہ توقع بھی کہ I hope you will seel the artclis not for your self. ہر وقت دل و دماغ پہ پہرا دیتی رہتی۔'' لہٰذا عابد سہیل نے دوسری راہ اختیار کی اور جولائی 1975 کو کتاب کا ضخیم الوداعی رسالہ شائع کر کے اسے الوداع کہہ دیا اور ایسا شاید پہلی مرتبہ ہوا کہ ایک ایک قارئین کی باقی ماندہ زر سالانہ رقم 2 مہینہ کے اندر واپس کر دی گئی۔الوداعی شمارہ کی ضخامت بھی دوڈھائی سو صفحات سے کم نہ تھی۔چودہ ساڑھے چودہ سو کاپی چھپوانے کے باوجود بھی تمام لوگوں کو مہیا نہیں کرائی جا سکی۔

ڈاکٹر فخر الکریم کتاب کے تعلق سے لکھتے ہیں

> ''کتاب اپنے خاص نمبروں کے لئے بھی شہرت رکھتا تھا۔اپنے (اپنی) اشاعت کے صرف آٹھ مہینے کے بعد ''شوکت تھانوی'' نمبر شائع کیا جو بہت مقبول ہوا۔۔۔کتاب کے سبھی خصوصی شمارے مقبول خاص و عام ہوئے ۱۹۶۴ء کا ''انتخاب افسانہ نمبر'' بہت پسند کیا گیا۔ اس شمارے میں ۱۹۶۲ء کی بہترین کہانیوں کا انتخاب رام لال اور عابد سہیل نے کیا تھا۔۔۔کتاب کے اشاعت کے دوران، کرشن چندر، بیدی، عصمت، علی عباس حسینی اور حیات اللہ انصاری وغیرہ کے افسانے سب سے پہلے اسی میں شائع ہوئے''(۲)

عابد سہیل نے طالب علمی کے دور سے لکھنا شروع کر دیا تھا جس کی ابتدا انھوں نے اپنے ایک انگریزی کے مضمون سے کی جو حکومت اتر پردیش کے انگریزی ترجمان 'اتر پردیش' میں شائع ہوا تھا اس وقت عابد سہیل انٹر میڈیٹ کے طالب علم تھے۔ پھر اس سلسلہ میں عمر کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا اور .15 اگست (1949ء) میں ان کا پہلا افسانہ 'دور آسمان کی خلاؤں میں' دیوان سنگھ مفتوں کے ہفت روزہ 'ریاست' کے ذریعہ منظر عام پر آیا۔ افسانوں کی پہلی با قاعدہ کتاب 1975 میں شائع ہوئی جس کا دوسرا ایڈیشن 1994 میں آیا۔ ایک سیمینار بعنوان: اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل میں پڑھے جانے والے مضامین کو ترتیب دیا جو کتابی شکل میں اردو اکادمی لکھنؤ سے 1981 میں چھپا۔ 1988 میں مزاح نگار احمد جمال پاشا کے مضامین کا انتخاب کیا جو اردو اکادمی لکھنؤ نے 1988 میں شائع کیا۔ 'جینے والے' دوسرا افسانوی مجموعہ 1998 میں منظر عام پر آیا۔ 'فکشن کی تنقید: چند مباحث' 2000 میں منصۂ شہود پر آئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن 2002 میں شائع ہوا۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے لئیق فتح علی کی کتاب Garden کا ترجمہ کرنے کے لئے عابد سہیل سے درخواست کی جس کو قبول کرتے ہوئے عابد سہیل نے باغات کے علم پر مشتمل ایک معلوماتی کتاب لکھ کر اردو ادب میں اضافہ کیا۔ 15 خاکوں پر مشتمل مجموعہ 'کھلی کتاب' عنوان سے 2004 میں شائع ہوا۔ عابد سہیل کی تیسرا اور آخری افسانوی مجموعہ 'غلام گردش' 2006 میں منظر عام پر آیا۔ ایچ جی ویلز کے ناول دی انویزیبل مین کا ترجمہ کیا جو 2006 غیر مرئی انسان کے عنوان سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا مونوگراف ہندوستانی ادب کے معمار سیریز کے تحت 2008 میں تصنیف کیا اسی سال 2008 میں عابد سہیل نے 'عبدالعلیم کی منتخب تحریریں' ترتیب دیں جسے نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کیا۔ رحمن رنگ کے عنوان سے عابد نیشاپوری کے دوہے ترتیب دیے جسے کاکوری پریس لکھنؤ نے 2009 میں شائع کیا۔ ایک سو ایک مختلف دانشوروں، فلسفیوں اور مفکر حضرات کے اقوال (اقوال زریں) کو حرف کائنات کے عنوان سے جمع کیا جس میں انگریزی اقوال کے ترجمے عابد سہیل نے کئے، اسے تخلیق کار پبلی شرز دہلی نے 2010 میں شائع کیا۔ علیم شناسی جس میں عابد سہیل نے وہ مضامین جمع کئے ہیں جو انھوں نے ڈاکٹر عبدالعلیم پر اہل قلم سے لکھوائے تھے، اس کی اشاعت 2012 میں ہوئی۔ اسی سال یعنی 2012 میں عابد سہیل کی سب سے زیادہ مقبول ہونے والی کتاب 'جو یاد رہا' (خودنوشت) شائع ہوئی جو تقریباً 700 صفحات پر محیط ہے۔ ایک کتاب 'درد کا شجر' (محبت کی کہانیاں) قومی اردو کاؤنسل برائے فروغ زبان اردو کے مالی تعاون سے 2012 ہی میں شائع ہوئی جس میں عابد سہیل نے کہانیوں کا ترجمہ اور انتخاب کیا ہے۔ اسی سال 2012 میں عبدالعلیم کے مضامین جن کو عابد سہیل نے جمع کیا تھا دو جلدوں میں مرتب کے مقدمہ کے ساتھ قومی کاؤنسل نے شائع کیا۔ عابد سہیل کے خاکوں کی دوسری کتاب پورے

آدھے ادھورے جس میں 25 خاکے شامل ہیں 2015 میں شائع ہو کر مقبول ہوئی۔" افسانیات ان کی آخری کتاب ہے، جسے پس مرگ ان کی اہلیہ انیس نصرت نے 2017 میں شائع کیا۔ اس کتاب میں عابد سہیل کی مختلف تحریریں شامل ہیں۔

عابد سہیل کی وفات 26 جنوری 2016 کو ممبئی کے اسپتال میں اور تدفین لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے انتقال پر ریاست کے گورنر رام نائک اور وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے تعزیت پیش کی۔ مختلف ادبی تنظیموں کی جانب سے تعزیتی نشستیں اور پروگرام کیئے گئے۔ سب سے پہلا تعزیتی پروگرام 28 جنوری 2016 کو اودھ نامہ کے بانی سید وقار مہدی رضوی نے اردو رائٹرس فورم کے تحت جے شنکر پرساد ہال، رائے اماناتھ بلی آڈیٹوریم قیصر باغ میں منعقد کیا۔

عابد سہیل کے قلم نے اردو نثر کے ارتقا میں نا قابل فراموش کردار ادا کیا۔ یوں تو اردو نثر کا آغاز بندہ نواز گیسو دراز سے قبل ہو چکا تھا مگر اس زمانے کی کسی بزرگ کی کوئی مستند تحریر نہیں ملتی۔ اردو کی پہلی نثری تصنیف میں بھی خاصہ اختلاف ہے۔ محمد دخان روزی کا رسالہ جنونیہ، خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ، فضلی کی کربل کتھا، گیسو دراز کی معراج العاشقین اور سید یوسف حسینی شاہ راجو کا رسالہ شاہ راجو کو الگ الگ محققین نے پہلی نثری تصنیف قرار دیا ہے۔ اس مقالے کی تحقیق کے دوران ان سبھی دعووں کے دلائل دیکھنے اور مباحث پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ "رسالہ شاہ راجو" پہلی نثری تصنیف کہلانے کا زیادہ حقدار ہے کیونکہ اس رسالہ کے طرز تحریر اور لسانی تشکیل پر سید یوسف حسینی شاہ راجو کے زمانے کی گہری چھاپ ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اسی زمانے میں لکھا گیا جب سوال و جواب کے انداز میں مذہبی مسائل پر مختصر رسالوں کی تخلیق رواج پا رہی تھی نیز جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ان میں "رسالہ شاہ راجو" دیگر کتابوں کی بہ نسبت شکوک وشبہات سے زیادہ پاک نظر آتا ہے۔ لہٰذا یہ رسالہ 795 ہجری یعنی 1392 عیسوی سے قبل تصنیف ہوا۔

اس زمانے میں مذہبی مسائل کو سمجھانے کی غرض سے صوفیائے کرام نے عام زبان (اردو) میں رسالے تحریر کیئے جس نے اردو زبان کی لسانی تشکیل میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے مگر ان میں ادبیت ناپید تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جمیل جالبی ان رسالوں کی گرانقدری کے حوالے سے رقمطراز ہیں

> "یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی محن اور صلاحیت سے زبان کے دریا کو بیان کے راستے پر ڈالا۔ آج وہ ہمیں مشکل، نامانوس اور بے معنی نظر آتے ہیں۔ آج ہمیں ان کی تحریروں پر ہنسی آتی ہے۔ اگر یہ لوگ اس دور میں اپنی صلاحیتوں کا خون

اس زبان میں شامل نہ کرتے اوراس میں زبان و بیان کے نئے نئے تجربہ (اور
یہ سب حقیقت میں تجربے ہیں) نہ کرتے تو سرسوتی کی طرح اس زبان کا دریا بھی
راستے ہی میں خشک ہوجاتا۔" (۳)

صوفیائے کرام نے اردو نثر نگاری کے نقش ابھار دئے تھے جس کے سبب ہی 17 ویں صدی میں اردو کی ادبی نثر کا باقاعدہ آغاز ملا وجہی کی تصنیف "سب رس" کی شکل میں ہوا۔ غیر افسانوی نثر میں ادبی نمونوں کا وجود 19 ویں صدی میں ملتا ہے جس میں خطوط نگاری، انشائیہ نگاری، سوانح عمریاں، خودنوشتیں، تذکرے اور سفرنامے وغیرہ کافی تعداد میں لکھے گئے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسوی صدی کے شروع میں غیر افسانوی روایت کو قابل ذکر استحکام حاصل ہوا۔ مذکورہ بالا اصناف کے علاوہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے 1927 میں ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ لکھ کر مکمل طور پر خاکہ نگاری کا آغاز کر دیا۔ اسی صدی میں ترقی پسند تحریک نے غیر افسانوی ادب کو برق رفتاری عطا کی اور تمام اصناف کے ساتھ ساتھ رپورتاژ کی بنیاد ڈالی۔ انیسوی صدی کے نصف آخر تک غیر افسانوی ادب اپنی ایک مستحکم روایت قائم کر چکا تھا۔ اب ضرورت تھی اس بات کی اس روایت کو منجمد ہونے سے بچایا جائے اور نئے تجربوں کے ساتھ غیر افسانوی نثر کو برتا جائے تاکہ اس میں تازگی باقی رہے۔ اس امر کو جن لوگوں نے انجام دیا ان میں عابد سہیل کا نام ناقابل فراموش ہے۔

"جو یاد رہا" عابد سہیل کی یادوں کا گلدستہ ہے جو زمانے کے امتداد کے ساتھ مزید شگفتہ نظر آرہا ہے۔ مصنف نے شب و روز کے واقعات اور صبح و شام کے حالات کو صدق دلی سے بیان کر دیا۔ نہ اپنی ناکامیوں کو چھپایا اور نہ ہی کامرانیوں کو بڑھایا۔ بشمول تصاویر کے یہ کتاب 712 صفحات میں ایک عہد کی تاریخ، تہذیب، سیاست، رواداری اور عادات و اطوار کی دنیا آباد کئے ہوئے ہے اسی لئے اس کتاب کو عابد سہیل کی ایک بہترین اختراعی و تخلیقی کاوش سمجھا جاسکتا ہے۔

"جو یاد رہا" تہذیب، تاریخ، تجربات، سیاست، صحافت، محبت، ادب، احترام، فریب خوری اور ناقابل فراموش واقعات پر مشتمل کتاب ہے۔ ان اوراق میں ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے قدم قدم پر زندگی نے کوئی نہ کوئی سبق ضرور دیا خواہ وہ اس کی اچھائی کی وجہ سے ہو یا پھر کوتاہی کی بنا پر۔ اسی لئے یہ کتاب مزید دلچسپ بن جاتی ہے۔ یہاں اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اس کتاب میں بہت سے ایسے واقعات بھی درج ہیں جن کی غیر ضروری طوالت قاری کو گراں معلوم ہوتی یا پھر چند ایسے ذکر جن کا کتاب یا صاحب کتاب سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ مثلاً صفحہ 352 پر "پارکنسن لا" عنوان کے تحت ایک صفحہ کی تحریر ہے جس میں پارکنسن کے بنائے

ہوئے اصولوں کی بات کی گئی ہے۔ یہ ذکر عابد سہیل نے صحافت کے ادارتی عملے، ملازمین اوران کی ملازمت کے تعلق سے درج کیا ہے حالانکہ یہاں پراس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔اس کی قرات کے بعد کتاب خودنوشت کے بجائے کسی مضمون کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔

عابد سہیل نے اس خودنوشت میں سماج کے بہت سے پہلوؤں کو آشکار کیا ہے،ہمیں جہاں منیر کی اماں، مولوی صاحب اور تیواری جی جیسے کردار ملتے ہیں وہیں ایسے لوگ بھی نظر آجاتے ہیں جن کی خودغرضی حیرت میں ڈال دیتی ہے۔اہل زبان کے عنوان سے عابد سہیل جہاں اردو کی کتابوں کے حالات بیان کرتے ہیں وہاں ایسے اشخاص سے وابستہ دلچسپ واقعات کی طرف نشان دہی بھی کرتے ہیں جن کواردو کے فروغ کے لئے چند پیسے بھی خرچ کرنا گوارانہیں۔

عابد سہیل کی خودنوشت میں ان کی زندگی کے نشیب وفراز کو پڑھتے ہوئے ہمیں اس دور کے سیاسی منظر نامے سے بھی آگہی ہوتی ہے اور سیاست دانوں کی سیاست سے بھی۔ان کا دور آج کی سیاست سے بہت مختلف تھا۔سیاست داں ایک دوسرے کے لئے ذہن کھلا رکھتے تھے عابد سہیل کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے،اس کے باوجود دیگر پارٹیوں کے افراد کی اچھائیوں کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے اگر موجودہ سیاست کو پیش نظر رکھا جائے تو مصنف کو اپنی پارٹی کے علاوہ دیگر گروہ اوران کے اراکین کو ہر محاذ پر آڑے ہاتھوں لینا چاہئے تھا یا پھران کی اچھائی کو پس پشت رکھ کر خامیوں اور نقائص کو اجاگر کرنا چاہئے تھا۔لیکن مصنف کی غیر جانبداری یہاں کارفرما نظر آتی ہے۔اس کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ مصنف نے سیاست میں رخصت ہوتی رواداری اور سیاستداں کے اخلاقی نقوش کواس میں محفوظ کرلیا ہے، جوآئندہ نسلوں کو یہ باور کراتے رہیں گے کہ پہلے کی سیاست میں کتنی سچائی اور محبت ہوا کرتی تھی۔

عابد سہیل کی خودنوشت 'جو یادرہا' غیر افسانوی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ مصنف نے اس میں ذاتی واردات و حالات کے ضمن میں اس عہد کے سماجی، سیاسی، ادبی، تہذیبی اور تاریخی واقعات وانقلابات کو جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب ہمیں اس عہد کی معلومات بہم پہنچاتی ہے جس میں تحریکات ورجحانات نے ادب کو خاصہ متاثر کیا۔

عابد سہیل کے نزدیک دو چیزیں ضروری رہیں ایک سانس لینا دوسرا لکھنا اسی لئے انھوں نے زندگی بھر قلم کا ساتھ نہیں چھوڑا اور جو پیشہ اختیار کیا یعنی صحافت اس نے بھی قلم اور دوات کی صورت میں دو ندیم ہمیشہ ان کے پاس رکھے جواس نشہ کو کم نہیں ہونے دیتے۔یہی سبب رہا کہ عابد سہیل نے ادب کی کئی اصناف میں گرانقدر اضافے

گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی شناخت ایک صحافی اور افسانہ نگار کی حیثیت سے قائم ہوئی لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کی خاکہ نگاری کو اردو ادب میں غیر معمولی شہرت ملی اور ان کے خاکوں کے دونوں مجموعوں کھلی کتاب (2004) اور پورے آدھے ادھورے (2015) کو عوام وخواص نے بہت پسند کیا۔ عابد سہیل نے خاکہ نگاری کا آغاز خود کو مانگے کے اجالے میں روشن کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ اس کا مقصد اپنے دوستوں کو یاد کرنا اور ان کے قابل تقلید پہلوؤں کو روشن کرنا تھا۔ عابد سہیل کے زیادہ تر خاکے احترام کے ساتھ ساتھ توازن کا بھرپور احساس دلاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے نظریہ کو نہ کبھی قلم پر حاوی ہونے دیا اور نہ ہی ذاتی چپقلش کو خاکہ کی روح مجروح کرنے کی اجازت دی۔ اسی لئے ان کے تحریر کردہ خاکوں میں ترقی پسند تحریک کے نمائندہ اور سرگرم اراکین احتشام حسین ،آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ کے خاکوں کے ساتھ ساتھ شمس الرحمان فاروقی ، حیات اللہ انصاری اور نیر مسعود وغیرہ کے خاکے بھی اپنی تابنا کی بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ عابد سہیل کے اس انتخاب نے ان کے خاکوں کو تہذیبی، ثقافتی اور نظریاتی اعتبار سے بہت وسعت بخشی ہے۔

عابد سہیل کے خاکے صرف بیان کردہ شخصیت سے ہی متعارف نہیں کرواتے بلکہ معلومات اور حیرت انگیز انکشافات سے بھی بھرے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ انکشافات اور باتیں ہیں جن کا ادراک دوسرے ذریعہ سے ممکن بھی نہیں تھا۔ مثلاً عابد سہیل نے احمد جمال کی مزاح نگاری کے آغاز کا ذکر کیا۔ جس کی شروعات ایک مذاق سے ہوئی تھی جس نے احمد جمال پاشا کو ایک پائے کا مزاح نگار بنا دیا۔

عابد سہیل نے اپنے خاکوں میں معتبر نقاد، مقبول فکشن نگار، مشہور شعراء وغیرہ کو موضوع بنایا لیکن خاکہ کا بنیادی اصول ہمیشہ پیش نظر رکھا اسی لئے ہمیں ان کے خاکوں میں فن کے بجائے فنکار زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، فن کی گفتگو خاکہ کو بوجھل بنا دیتی ہے اور اس ثقیل گفتگو کے لئے دوسری اصناف موجود ہیں۔ اس زمرے میں احتشام حسین، آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری، مجاز لکھنوی، شمس الرحمان فاروقی، نیر مسعود، عرفان صدیقی، شوکت صدیقی کے خاکوں کو رکھا جا سکتا ہے۔ ان تمام ادبا کے فن پر کئی کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں جن سے ان کی شاعری، تنقید نگاری اور افسانہ نگاری کو سمجھا جا سکتا ہے لیکن عابد سہیل کے خاکے کو پڑھ کر ان ادیبوں کی وضع قطع، باطنی کیفیت، علمی تبحر، نفسیاتی کشمکش، ذاتی پریشانی اور اَن کہے واقعات کا پتہ چلتا ہے۔

عابد سہیل نے تحریر کردہ خاکوں کو اہم واقعات سے سجایا ہے نہ کہ یادداشتوں کی کھتونی تیار کی ہے۔ اپنے ممدوح کو انسانی شکل میں پیش کرنے کے لئے اس کے مستحسن و مستحکم پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مخفی و کمزور گوشوں کو بھی لکھ دیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خاکہ نگار نے کمزوری کا ذکر خاکہ کو استحکام بخشنے کی حد تک ہی کیا

ہے۔صرف ایک خاکہ ڈاکٹر عبدالعلیم کا ایسا ہے جہاں عابد سہیل کی تحریر خود کو عقیدت کی گرفت سے باہر نہیں نکال پائی۔عبدالعلیم کی ہمہ جہت شخصیت کو اجاگر کرتا یہ خاکہ آغاز تا اختتام ایک ہی رنگ میں دکھائی دیا اس کی فضا ایک ہی رخ پر چلتی نظر آئی۔

عابد سہیل نے غیر ذی روح اشیا اولڈ انڈیا کافی ہاؤس اور ماہنامہ رسالہ "کتاب" سے متعلق تحریروں کو اپنے خاکوں کے مجموعوں میں شامل کیا۔عابد سہیل کی دونوں تحریریں خاکہ کے زمرے میں شمار کی جائیں گی یا نہیں! یہ موضوع قدرے بحث طلب ہے۔المختصر ایک بہترین خاکہ میں اتنی معلومات ضرور ہونا چاہئے کہ قاری خاکہ نگار کے منتخبہ موضوع سے آشنا ہو سکے۔اسی کے پیش نظر خاکہ کے فن کو ترتیب دیا گیا ہے۔اب اگر عابد سہیل کی ان دو تحریروں یعنی اولڈ انڈیا کافی ہاؤس اور ماہنامہ کتاب کو دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ اپنے موضوع کی ایک واضح شکل قاری کے سامنے پیش کرتی ہیں۔اب یہاں ایک اشکال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ مضمون بھی اپنے موضوع کی معلومات فراہم کرتا ہے تو کیوں نہ اسے بھی مضمون ہی کے زمرے میں رکھا جائے۔اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مضمون کے اقتباسات ترتیب وار ہوتے ہیں جس کے اختتام پر مضمون نگار کوئی نتیجہ پیش کرتا ہے اور اس کی زبان بھی سنجیدہ ہوتی جبکہ خاکہ کی تحریر میں مذکورہ باتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا اور عابد سہیل کی ان دونوں تحریروں میں نہ تو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے، نہ ہی سنجیدہ زبان ہے اور نہ کسی ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے اس لئے اسے مضمون کہا جانا درست نہیں۔ ان تحریر کو انشائیہ میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہاں بے ترتیبی، غیر سنجیدہ زبان تو موجود ہوتی ہے لیکن موضوع علامتی ہوتا ہے جب کہ خاکہ کی یہ صفت ہے کہ یہاں موضوع علامتی نہیں ہوتا بلکہ ہر ہر لفظ کا تعلق براہ راست موضوع سے ہی ہوتا ہے۔

اس بحث کی روشنی میں عابد سہیل کی ان دو تحریروں کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ لکھنے والے نے ان بے جان اشیا میں پائی جانے والی زندگی تلاش کر لی تھی۔اولڈ انڈیا کافی ہاؤس صرف ایک عمارت نہیں تھا بلکہ ملکی، ملی، سماجی اور ادبی مسائل پر معنی خیز بحث کا مرکز تھا اور لکھنؤ کی مائل بہ زوال تہذیب کی بہت بڑی علامت بھی۔ جہاں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، ڈی پی مکھرجی، ڈاکٹر عبدالعلیم، آنند نرائن ملا، امرت لال ناگر، احتشام حسین، ایم چلپت راؤ، پشپال، ڈاکٹر ویر بہادر سنگھ، مجاز، شوکت صدیقی، سلام مچھلی شہری وغیرہ معزز ترین افراد جمع ہوتے تھے۔اس خاکہ نگاری میں زیادہ ذکر ہمیں ان ہی افراد کا ملتا ہے جو یہاں شریک محفل ہوا کرتے تھے، لیکن یہ خاکہ نگار کی سحر بیانی ہے کہ اس نے "اہل محفل" کے ذکر سے "جائے محفل" کو روشن کر دیا ہے۔

عابد سہیل کی دوسری تحریر ان کے ماہنامہ رسالے "کتاب" کی روداد حیات بیان کرتی ہے۔کتاب کی

اشاعت اوراس میں پیدا ہونے والے مسائل، رسالے سے متعلق اپنوں اور غیروں کے رویے، مالی فراہمی، مقبولیت کے اسباب، ترتیب میں توازن، وسعت نظری، ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبرز کا انتخاب، اہل قلم حضرات کی آرا اور خود عابد سہیل کی محنت ومشقت کے ساتھ ساتھ ان کا درد دل بھی اس تحریر کو مکمل اور منفرد بنانے میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اس تحریر میں ایک بے جان کا احوال نہایت پراثر اور شدت جذبات کے ساتھ موجود ہے۔ عابد سہیل جب رسالہ کے الوداعی نمبر کا ذکر کرتے ہیں تو مصنف کے ساتھ ساتھ قاری کی بھی آنکھیں آبدیدہ ہوجاتی ہیں اور اسے اس رسالہ سے ہمدردی پیدا ہوجاتی۔

مذکورہ بالا تمام صفات جو خاکہ میں پائی جاتی ہیں وہ عابد سہیل کی دونوں (اولڈ انڈیا کافی ہاؤس اور ماہنامہ کتاب) تحریروں میں موجود ہیں مگر پھر بھی انھیں خاکہ کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا کیونکہ خاکہ کی جتنی بھی تعریفات ماہرین فن نے بیان کی ہیں ان میں خاکہ صرف کسی جاندار کا ہی لکھا جاسکتا ہے اور اگر کسی غیر ذی روح کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس پر جاندار کا گمان ہونے لگے تو اسے "تجسیم" کی فہرست میں شمار کیا جائے گا۔

"تجسیم" کا زیادہ تر استعمال انشائیوں یا پھر طنزیہ تحریروں میں کیا جاتا ہے۔ داستان میں بھی ایسے عناصر مل جاتے ہیں۔ عابد سہیل نے بھی غیر ذی روح اشیا کو اپنی فنکاری اور سحر بیانی سے اس طرح پیش کیا ہے کہ غیر ذی روح اشیا انسانی صفات سے مزین ہوگئی ہیں۔ قاری ان میں زندگی کے آثار محسوس کرتا ہے۔ ایسا گمان ہوتا ہے جیسے یہ بے زبان عمارت اپنے واردات قلبی خود بیان کررہی ہو اور خاموش کتاب حالات کی ستم ظریفی پر شکوہ سنج ہو۔ لہٰذا یہ تجسیم کی عمدہ مثالیں تو گردانی جاسکتی ہیں مگر صنف خاکہ میں ان کو نہیں رکھا جاسکتا۔

ان خاکوں کے علاوہ ایک تحریر خطوط کی ٹکنیک میں بھی لکھی گئی ہے۔ یہ سریندر کمار مہرا کے بارے میں ہے۔ حالانکہ اس کو خاکہ اس لئے نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ فنی لوازم کو پورا کرنے میں ناکام ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً خاکہ نگار اپنے ممدوح سے کبھی نہیں ملا، اس لئے حلیہ سازی کی گنجائش ہی ختم ہوجاتی ہے۔ اس کی عادت سے واقف نہیں، اس کی نفسیاتی کشمکش کی وہ نہیں جانتا اور وہ اپنے موضوع کو صرف اس حد تک ہی جان سکا جتنا خطوط میں اس نے خود کو آشکار کیا۔ اس وجہ سے خاکہ نگار اپنے ممدوح کو قاری کے سامنے پوری طرح اجاگر نہیں کرسکا۔ اس ٹکنیک کی مدد سے افسانہ اور ناول بھی لکھے گئے ہیں لیکن خاکوں میں یہ تجربہ پہلی بار عابد سہیل نے کیا۔

عابد سہیل کے خاکوں کو پڑھ کر یہ اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اردو خاکہ نگاری کی روایت کو جدت کے ساتھ وسعت دینے میں عابد سہیل کے دونوں مجموعے اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ خاکے عابد سہیل نے نہیں بلکہ ایک صحافی، افسانہ نگار، مترجم، خودنوشت نگار اور بہترین دوست نے لکھے ہیں جس نے خاکہ کی فضا کو ہر پہلو سے مختلف

النوع رنگوں سے بھر دیا ہے۔

عابد سہیل نے ترجمہ نگاری کا آغاز فرضی ناموں سے کیا۔ ان کے تراجم مختلف رسائل میں شائع ہوئے جو مترجم کی عدم توجہی کے باعث محفوظ نہ رہ سکے۔ عابد سہیل کے ایک انٹرویو کے مطابق انھوں نے ترجمہ کا آغاز 1950 سے قبل تین چار بنگالی کہانیوں (جو انگریزی میں تھیں) کو اردو میں منتقل کر کے کیا تھا اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں

> "ان میں سے ایک ترجمہ پاکستان کے" ماہ نو" میں شائع ہوا تھا اور اس کا معاوضہ مجھے بذریعہ منی آرڈر ملا تھا۔ ۴

ان تراجم کے بعد عابد سہیل نے باقاعدہ مترجم کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت قائم کی۔ ان کے نام سے سب سے پہلا شائع ہونے والا ترجمہ ایڈ گرویلیس کا ناول ہے جو 1957 میں" سبز بھوت" کے نام سے منظر عام پر آیا تھا جو اب تک کوششوں کے باوجود بھی دسترس سے باہر ہے۔ عابد سہیل نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ کچھ عرصہ تک علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری کی کیٹ لاگ میں اس کتاب کا نام دیکھا گیا تھا۔

عابد سہیل کے غیر معمولی اور تخلیقی تراجم میں ایچ جی ویلس کے ناول The Invisibel Man کا ترجمہ غیر مرئی انسان کے نام سے کافی مقبول ہوا۔ کچھ الفاظ کے ترجمے میں عابد سہیل نے شمس الرحمان فاروقی سے بھی مدد لی تھی۔ اس ناول کا ترجمہ تقریباً نصف صدی میں مکمل ہو پایا۔ اس کی کہانی بھی عابد سہیل کی باقی ساری کہانیوں کی طرح ہی بڑی دلچسپ ہے۔ عابد سہیل نے پیش لفظ میں اس ناول کے بارے میں چند صفحات میں گفتگو بھی کی ہے۔ اس کے کمزور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

عابد سہیل انگریزی کے موقر اخبار نیشنل ہیرالڈ سے ایک عرصہ تک وابستہ رہے اس لئے انھیں الفاظ کے محل استعمال سے اچھی طرح واقفیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ترجمہ نگاری میں ندرت اور جدت نظر آتی ہے۔ عابد سہیل نے صرف انگریزی الفاظ کو اردو میں منتقل نہیں کیا بلکہ ایک اپنی تخلیقی فنکاری سے پوری فضا کو دلچسپ اور قابل رشک بنا دیا ہے۔ چےخف کے افسانہ" جان من" کا اقتباس دیکھئے

> "It was not till six months later that she took off the weepers and opened the shutters of the windows. She was sometimes seen in the mornings, going with her cook to market for provisions, but what went on in her house and

how she lived now could only be surmised.

)"۵)

اب عابد سہیل کے اس ترجمہ پر نظر ڈالئے جو اس اقتباس کے مقابل میں انھوں نے کتاب میں درج کیا ہے۔

"چھے مہینے گذرنے کے بعد اس نے ماتمی لباس اتارا اور دروازے کے پٹ کھول دیے۔ اس نے صبح کبھی کبھی اپنے باورچی کے ساتھ بازار جانا شروع کر دیا لیکن گھر کے اندر وہ کیسے رہتی اور وہاں کیا ہوتا اس کے بارے میں صرف قیاس کے گھوڑے دوڑائے جا سکتے ہیں۔"(۶)

اس اقتباس میں عابد سہیل نے اصل متن سے بہتر انداز میں ایک سوگوار فضا کا اظہار کیا ہے۔ ساتھ ہی محاوراتی زبان اتنا بروقت اور برجستہ ہے کہ قاری کہانی سے نہایت قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ Weepers کے لئے "ماتمی لباس" کا استعمال یا پھر "قیاس کے گھوڑے دوڑانا" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

عابد سہیل کے ترجموں میں تہذیب کا رنگ، ثقافت کا عکس، مصنف کی ذہنی کیفیت اور دم تحریر کے عہد کے ساتھ ساتھ تخلیقیت کی آنچ بھی نظر آتی ہے۔ اس معیار کے تراجم اردو ادب میں کم دیکھنے کو ملیں گے۔ اس لئے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ عابد سہیل نے ترجمہ نگاری میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔

عابد سہیل کے اندر ادبی ماحول اور ادب کے لئے ایک بے چینی تھی۔ چونکہ ان کا تعلق براہ راست صحافت سے تھا اور صحافت میں معاشرے کی سوچ کو بدل دینے کی قوت ہوتی ہے، اس نظریے کے تحت وہ "کتاب" کے اداریوں کے ذریعہ ادبی دنیا میں ایک انقلاب لانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے قارئین میں ہی رجحان پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وہ اچھے اور معمولی ادب میں تمیز کر سکیں، بے روح اور حیات بخش تحریروں کے معیار متعین کریں اور تہذیب اور تاریخ کی تعمیر میں ادب کے کردار کو سمجھیں۔ اس تعمیر میں وہ مدیر، مضمون نگار اور قاری کا مثلث قائم کرتے ہیں اور اس طرح اس امر مہم میں تینوں کو شریک کر لیتے ہیں۔

عابد سہیل کے اداریوں میں سطحی گفتگو کے بجائے وسیع النظری اور دور اندیشی پائی جاتی ہے۔ وہ وقتی چکا چوند میں گم سم نہیں ہوتے بلکہ لمحے بھر کی رنگارنگی کو پُر رونق کہکشاں بنانے کی فکر کرتے ہیں جس کی ضوفشانی دیرپا اور دوررس ثابت ہو۔ اس حوالے سے ان کے وہ اداریے کافی اہم ہیں جو ملک گیر سطح پر غالب صدی منائے جانے کے قریب شائع ہوئے۔ انھوں نے متعدد اداریے اردو کے مسائل سے متعلق لکھے ہیں مثلاً اگست 1971 کے شمارہ کا اداریہ جس میں خبر دی گئی ہے کہ وزیر اعظم کے اعلان کے بعد ریاسی حکومت اردو اکادمی کے قیام اور محکمہ تعلیم میں

ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) کی تقرری کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ یا پھر اس کے بعد شائع ہونے والا اداریہ جس میں اردو کی کتابوں اور رسائل کے مسائل کو موضوع قلم بنایا ہے۔ ان کے اداریے محض "کیا ہوا" یا "کس طرح ہوا" پر ختم نہیں ہوتے بلکہ مسئلہ کے ممکنہ حل کی تلاش بھی ان کے یہاں نظر آتی ہے۔

عابد سہیل کے اداریے ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاحی اور علمی ہوتے تھے۔ ان میں ادبی رجحانات، تنقیدی میلانات اور عصری تحریکات کے علاوہ سماج کو بہتر بنانے کی منصوبہ سازی بھی ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اداریے اپنے زمانے کے سماج کا آئینہ دار ہوتے۔ عابد سہیل نے اداریوں کے موضوعات کو اردو کے حدود میں قید نہیں کیا بلکہ غیر اردو ادب اور شخصیات پر بھی لکھا۔ کتاب کے بعض اداریوں کو نہ تو گردش ایام گرد آلود کر سکے گی اور نہ ہی امتداد زمانہ اس کی تازگی پر اثر انداز ہو پائے گا۔ عابد سہیل کی یہ تحریریں ہر زمانے کے قاری کو روشن ضمیر بنا رہی ہیں۔

ادب نوازی میں عابد سہیل کی علیم شناسی کو ایک مستحسن قدم کی حیثیت سے دیکھا جا تا رہا ہے۔ عبدالعلیم کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ اسلامیات، تاریخ، ادب، صحافت جیسے اہم موضوعات کے علاوہ عملی زندگی میں بہ یک وقت مختلف محاذ پر ثابت قدم رہے۔ دبیز پرتوں میں ڈھکی ان کی شخصیت کو عابد سہیل نے حتی المقدور نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، ساتھ ہی ان کی تحریروں کی مختلف افادی پہلوؤ کو بھی روشن کیا ہے۔

عبدالعلیم عابد سہیل کے رشتے کے ماموں تھے۔ بچپن سے ہی عابد سہیل ان کی فعالیت اور قابلیت سے متاثر تھے بلکہ متاثر کی جگہ "مرعوب" لفظ کا استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ عبدالعلیم ترقی پسند تحریک کے نظریہ سازوں میں تھے اور عابد سہیل اس تحریک کے سرگرم رکن۔ تحریک کے تئیں ان کا مخلصانہ رویہ اراکین کے جوش و ولولہ کو ہمیشہ گرم رکھتا۔ صرف تحریک کے اراکین ہی نہیں بلکہ عبدالعلیم کی سادہ مزاجی اور علمی شخصیت نے ایک عالم کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ ان کی خاموش طبیعت میں فکر و دانشوری کا ایک سمندر موجزن تھا۔ تفکرات کے اس عمیق سمندر میں نئے سماج کی تعمیر اور مستقبل کی ترقی کا خزانہ پوشیدہ تھا۔ لیکن یہ جواہرات ان کی زندگی یا انتقال کے کچھ عرصہ بعد تک قرطاس ابیض میں منظم طور پر منتقل نہیں ہو سکے تھے۔ عابد سہیل نے اس قبیل قدم اٹھایا اور ان جواہر پاروں کو مختلف کتب کے ذریعہ عوام کی خدمت میں پیش کیا۔ اس حوالے سے ان کی مرتب کردہ کتابوں عبدالعلیم کی منتخب تحریریں (2008)، ہندوستانی ادب کے معمار: عبدالعلیم 2008 (مونوگراف) علیم شناسی (2012) ،کلیات عبدالعلیم دو جلدیں (2012) کے علاوہ مضامین اور کھلی کتاب میں شامل خاکہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

عابد سہیل چونکہ خود ایک ناقد تھے اور نظریات کی طرفداری میں وہ خاصے متشدت تھے تاہم توازن کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹا۔ اسی توازن نے انھیں عبدالعلیم کی تحریروں کو پڑھنے اور سمجھنے پر راغب

کیا۔ عابد سہیل نے عبدالعلیم کے اہم مضامین جیسے مارکسزم اور ادب، اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر، ترقی پسند ادب کے بارے میں چند غلط فہمیاں، ادب کا مستقبل، ادبی تنقید کے بنیادی اصول اور مسلم یونیورسٹی نیا دور وغیرہ میں پوشیدہ نظریات کو روشن کیا ہے۔ اس سے نہ صرف ادب کے بنیادی مسائل اور استعمال ہونے والی اصطلاعات وغیرہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ ادب اور تنقید دونوں کی افہام و تفہیم کے نئے زاویے بھی روشن ہوتے ہیں۔ ان کی خدمات قلم کی حد تک محدود نہ تھیں بلکہ وہ دامے، درمے، سخنے ہر طرح سے اردو کے احیا و فروغ کے لئے سرگرم رہے۔ عبدالعلیم نے ترقی اردو بورڈ کے بیورو کی حیثیت سے فرہنگ آصفیہ چھاپی، انگریزی اردو انگریزی لغات اور اردو انسائیکلو پیڈیا کا ڈول ڈالا، دہلی اور اردو کے علاقوں میں کتابت کے اسکول کھولے، املا کی معیار بندی کا کام تقریباً مکمل کر دیا اور مختلف علوم کی کئی اہم کتابوں کے تراجم کرائے۔

جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو سمسٹر سسٹم کو نافذ کیا، پرانی تصاویر، نقشوں کی مدد سے یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں کی قیام گاہ کو اصل صورت میں نو تعمیر کی کوشش، یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں بیچلر آف یونانی میڈیسن کے پانچ سالہ کورس کے بعد کی تعلیم کا بندوبست (ہندوستان کے کسی اور طبیہ کالج میں اس وقت یہ انتظام نہیں تھا) وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر عبدالعلیم نے یونیورسٹی کے درجہ چہارم کے ملازمین کی ملازمتیں مستقل کر دیں جو ایک سال سے زائد اپنی خدمات انجام دے رہے تھے، اور یہی قانون نافذ ہو گیا۔ خواتین کے لئے بھی پانچ فیصد نشستیں محفوظ کر دیں اور یہی صورت اقوام درج فہرست کے لئے اختیار کی۔

الغرض عابد سہیل نے ایک بھرپور زندگی جی، جس میں تجربات و مشاہدات کے علاوہ قلمی نگارشات اور عملی خدمات کو نمایاں و منفرد مقام حاصل ہوا۔

مفروضات و مقاصد

اپنے تحقیقی مقالے کا آغاز جن مفروضات و مقاصد کو نظر میں رکھتے ہوئے کیا تھا وہ اس طرح ہیں

۱۔ عابد سہیل کی سوانح اور ساخت و پرداخت میں کارفرما عوامل کی نشاندہی کرنا۔

۲۔ مترجم کی حیثیت سے عابد سہیل کی خدمات کا جائزہ لینا۔

۳۔ عابد سہیل کے اداریوں سے اس زمانے کی ادبی رفتار و رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

۴۔ عابد سہیل کی خودنوشت ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

۵۔عابد سہیل نے ادبی وسیاسی شخصیات کے علاوہ غیر ذی روح کے خاکے بھی تحریر کیے ہیں
٦۔عابد سہیل کی سرپرستی میں نکلنے والا رسالہ کتاب نے اپنے عہد کے نوجوان قلمکاروں کی تربیت کی ہے۔
۷۔عابد سہیل نے اپنی تحریروں (غیرافسانوی) میں فن کے تقاضوں کو بخوبی برتا ہے

اپنی تحقیق کی روشنی میں مذکورہ مقاصد اور مفروضات کے جن پہلوؤں تک میری رسائی ہوسکی ہے وہ پیش خدمت ہیں۔

ا۔عابد سہیل کی ساخت اور پرداخت کے تعلق سے اورئی، بھوپال اور لکھنؤ کی فضا کارفرما رہی ہے۔ان کا بچپن اورئی میں گزرا جہاں اپنے دادے ابا یعنی سید وزیر حسن اور والد یعنی سید ظفریاب حسن سے شرافت اور تہذیب سیکھی، محبت اور تعلیم سے رغبت ماں کی دین تھی۔وہاں مذہبی پروگرام نے انھیں ہر مسالک کے ادب واحترا کا درس سکھایا۔چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں اپنی والدہ کے ساتھ مجلسوں میں جایا کرتا تھا اور محلوں میں میلاد کے وقت ہونے والے پروگرام میں ایک بار نعت بھی پڑھی تھی۔بھوپال کا زمانہ ان کی شعور کی پختگی کا تھا۔وہاں پھوپھی اور پھوپھا کی زیر سرپرستی وہ زندگی کے سمت طے کر رہے تھے۔یہ دور عابد سہیل کی زندگی میں نہایت اہم معلوم ہوتا ہے۔ابتدائی تعلیم کا آغاز یہیں سے ہوا، پھوپھا کی گھڑی چرائی، سید محمد عابد سے عابد سہیل یہیں ہوئے اور یہیں سے وہ بغیر کسی کو بتائے ایک مولوی صاحب کے ساتھ اورنگ آباد چلے گئے۔اس دوران عابد سہیل کے شعور میں اچھے برے کو سمجھنے پرکھنے کی صلاحیت پیدا ہوچکی تھی جس اثر لکھنؤ پہنچنے کے بعد دکھائی دیتا ہے۔ان کی یہاں کی زندگی بہت سے واقعات سے پر ہے۔تعلیم، ملازمت، شادی، ادبی سرگرمی، سیاسی ایکٹویٹی، دوست، احباب، غلطی پچتاوا ان سب کا تجربہ اس شہر میں انھیں ہوا۔لکھنؤ آنے کے بعد ان کی زندگی نے تین اہم موڑ لئے پہلا صحافت میں انھوں نے غیر معمولی ترقی حاصل کی۔دوسرا پوشیدہ صلاحیتوں کو سامنے آنے کا موقع ملا اور قیمتی تحریریں منظر عام پر آ سکیں۔تیسرا وہ ایک خودکفیل یعنی سیلف میڈ انسان بننے میں کامیاب رہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور کارناموں پر تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں۔

۲۔عابد سہیل نے 1950 سے قبل ترجموں کا کام شروع کر دیا تھا مگر اس وقت کے تراجم نہ تو ان کے نام سے شائع ہوتے تھے اور نہ ہی ان کی نوعیت باقاعدہ ترجموں والی تھی۔کہانی کو پڑھ کر اپنے الفاظ میں اس طرح لکھ دینا کہ قاری مطلب و مفہوم سمجھ لے کافی جانا جاتا تھا۔اس سے فائدہ بس یہ ہوا کہ انھیں ترجموں کی مشق ہوگئی اور جب انھوں نے باقاعدگی سے ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تو مزید مشق نے "نور علی نور" کی شکل اختیار کر لی اور وہ ایک

بہترین مترجم بن گئے۔ ان کے ترجموں میں غیر مرئی انسان (The Invisibel Man) اور درد کا شجر جس میں طبعزاد کہانیوں کے ساتھ ساتھ انگریزی و فرانسیسی کہانیوں کا ترجمہ بھی شامل ہیں، کو بہت مقبولیت ملی۔ ان تراجم اور باغات کو دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ عابد سہیل نے ترجموں میں تخلیقیت سے کام لیا ہے اور بطور مترجم وہ ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔

۳۔ عابد سہیل نے کتاب کے اداریوں میں روایتی ادیبوں کی تعریف یا پھر کسی صنف کی تاریخ بیان نہیں کی ہے۔ انھوں نے وقت کی ضرورت پر زور دیا ہے اور کوشش یہی کی ہے کہ زبان و ادب کے ساتھ ساتھ سماج کی خدمت کی جائے۔ اسی لئے اپنے اداریوں میں وہ حکومت کی پالیسیوں اور عوام کے نظریوں دونوں سے بحث کرتے ہیں۔ جس کی بہت سی مثالیں متعلقہ باب میں ذکر کی گئی ہیں، ان مثالوں کی روشنی میں یہ اقرار حق بجانب ہے کہ عابد سہیل کے اداریے اپنے زمانے کی ادبی رفتار و رجحان کا پتہ دیتے ہیں۔

۴۔ "جو یاد رہا" عابد سہیل کا ایسا زندگی نامہ ہے جس میں علاقائی تہذیب، پوشیدہ تاریخ، متحیر واقعات، کمیاب کردار، قابل رحم اشخاص، ادب اور ادیب، زبان و رجحان جیسے خارجی عناصر کے علاوہ انسانی نفسیات، طبعی میلانات، فکری تسامحات، معصوم خیالات اور شدید جذبات جیسے باطنی احساسات کا تجربہ قاری کو قدم قدم پر ایک نئے جہان سے روشناس کراتا ہے۔ تحقیق مکمل ہونے کے بعد اسے صرف ایک تاریخی دستاویز کہنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ یہ کتاب ایک خاص عہد کی تاریخ تو بیان کرتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ کچھ اصول و نظریات بھی وضع کرتی ہے جو ہمیں زندگی جینے کا ڈھنگ سکھاتے ہیں۔

۵۔ عابد سہیل کی خاکہ نگاری میں فن پوری طرح جلوہ گر ہے۔ زبان و بیان بھی اپنی الگ آب و تاب رکھتا ہے اور اس پر مستزاد طنز و مزاح کی چاشنی خاکوں کو بوریت سے محفوظ رکھتا ہے۔ مگر ڈاکٹر عبدالعلیم کے خاکہ میں عقیدت خاکہ نگار کے قلم سے آگے آگے چلتی نظر آتی ہے اور ڈاکٹر سرکشور کا خاکہ جو خط کی ٹکنیک میں لکھا ہے اسے خاکہ کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ خاکہ کا فن موضوع سے اچھی خاصی آشنائی کا متقاضی ہے۔ اب رہی بات غیر ذی روح خاکے لکھنے کی تو ماہرین فن کی تعریفات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "خاکہ" کا موضوع کسی جاندار کو ہی بنایا جا سکتا ہے اور اگر کسی غیر ذی روح کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس پر جاندار کا گمان ہونے لگے تو اسے "تجسیم" کی فہرست میں شمار کیا جائے گا۔ "تجسیم" کا زیادہ تر استعمال انشائیوں یا پھر طنزیہ تحریروں میں کیا جاتا ہے۔ داستان میں بھی ایسے عناصر مل جاتے ہیں۔ عابد سہیل نے بھی غیر ذی روح اشیا کو اپنی فنکاری اور سحر بیانی سے اس طرح پیش کیا ہے کہ غیر ذی روح اشیا انسانی صفات سے مزین ہوگئی ہیں۔ قاری ان میں زندگی

کے آثار محسوس کرتا ہے۔ایسا گمان ہوتا ہے جیسے یہ بے زبان عمارت اپنے واردات قلبی خود بیان کر رہی ہو اور خاموش کتاب حالات کی ستم ظریفی پر شکوہ سنج ہو۔لہٰذا یہ تجسیم کی عمدہ مثالیں تو گردانی جاسکتی ہیں مگر صنف خاکہ میں ان کو نہیں رکھا جاسکتا۔

۶۔کتاب رسالہ 1962 سے لیکر 1975 تک مسلسل نکلتا رہا۔اس دور کے ادیبوں اور خاص طور سے افسانہ نگاروں کی نسل کا بڑا حصہ جو 1980 کے آس پاس ادب کے افق پر ابھرا بڑی حد تک کتاب ہی کے ذریعہ متعارف ہوا یا پہچانا گیا۔

ماہنامہ 'کتاب' نے تقریباً 13 سال تنقیدی اور نئے رجحانات ومسائل پر مشتمل مضامین اور خصوصی نمبروں وگوشوں کی اشاعت سے اردو ادب کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے جس نے اردو کی ادبی روایت کو مستحکم کیا ہے اور نئے لکھنے والوں کی ذہنی تربیت کی ہے۔۔۔کتاب کے اشاعت کے دوران، کرشن چندر، بیدی، عصمت، علی عباس حسینی اور حیات اللہ انصاری وغیرہ کے افسانے سب سے پہلے اسی میں شائع ہوتے۔

۷۔عابد سہیل نے جس صنف میں طبع آزمائی کی اس کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھ کر کی یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جس کام کے لئے ڈول ڈالا اس کی تکمیل ایماندارانہ طریقہ سے کی۔ان کی ہر تخلیق میں افادی پہلو کے ساتھ ساتھ ادبی حسن ضرور نظر آتا ہے جو ان کی تحریر کو' کالے اکشروں' کی بھیڑ میں کھونے نہیں دیتا۔ چاہے وہ صحافت کا پیشہ ہو یا پھر لکھنے کا کام۔غیر افسانوی ادب کے تعلق سے ان کی تحریروں میں خاکے، خودنوشت، اداریے، تراجم، مونو گراف کے علاوہ بعض متفرق تحریریں مثلاً فکشن کی تنقید، تبصرے، دیباچے اور مضامین وغیرہ شامل ہیں۔

مذکورہ بالا معروضات اور تحقیقی مقالے میں اخذ کئے گئے نتائج کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ عابد سہیل نے غیر افسانوی ادب کا تقریباً مکمل حصہ فنی تقاضوں کی پاسداری کرتا ہے، جس میں بہر حال تجربوں کی دھوپ جابجا ضرور منعکس ہوتی ہے۔

حواشی

۱۔ جو یادرہا، عابد سہیل، ، اردو اکادمی دہلی 2012، صفحہ 66

۲۔ عابد سہیل، ڈاکٹر صبیحہ انور (مرتبہ)، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 2019، صفحہ 03-102

۳۔ تاریخ ادب اردو جلد اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2017 صفحہ 136

۴۔ ممتاز عالم: عابد سہیل سے انٹرویو، اردو دنیا، دہلی 2006 اگست ص 10

۵۔ https://www.gutenberg.org/files/13416/13416-h/13416-h.htm

۶۔ درد کا شجر، عابد سہیل، عرشیہ پبلی کیشن 2012، صفحہ 282